© rasailojaraid.com

مقالات

تفریق دین وسیاست

از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء - لکھنؤ

مسلم ممالک بالخصوص ٹرکی میں بیسویں صدی کی ابتدا سے جدید تعلیم یافتہ اور "ترقی پسند" گروہ میں دین وسیاست کی تفریق کا رجحان پیدا ہو گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے نظم ونسق، قانون سازی اور سیاسی معاملات کو دینی احکام وتعلیمات کی پابندی سے بالکلیہ آزاد کر دیا جائے۔ خالص دنیوی تعلیم پائے ہوئے لوگ ان معاملات کو دنیوی طریق پر چلائیں اور علمائے دین کا منصب خالص دینی رہنمائی اور مذہبی رسوم و فرائض کی ادائیگی قرار پائے۔ ۱۹۲۳ء میں اس خیال کے لوگوں کو ٹرکی پر کلی تسلط حاصل ہوا اور ایک دو سال کے اندر اندر انہوں نے ٹرکی کے نظام حکومت اور نظام تمدن ومعاشرت کو دین کے جملہ اثرات سے پاک کر کے ترکی کو ایک خالص دنیوی ریاست بنا دیا۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کے ساتھ یہ رجحان پہلے سے موجود تھا۔ لیکن ۱۹۳۰ء سے مختلف اسباب کی بنا پر یہ خیال جدید طبقہ میں نہایت سرعت کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب و محرکات ٹرکی سے بالکل مختلف ہیں مگر دینی اقتدار اور اسلامی زندگی کے حق میں نتیجہ یکساں ہے۔ یہ مسئلہ ہماری ملی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے اور جذبات واثرات سے ہٹ کر فریقین کے کامل غور وفکر کا محتاج ہے۔ میں اس مسئلہ کی تاریخ، مختلف ممالک میں اس کے اسباب و دواعی، اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں اور اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ یہ غنیمت ہے کہ کم از کم ہندوستان میں ابھی اسلامی نقطۂ نظر کی اہمیت باقی ہے۔ ورنہ دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممالک میں تو اس کا شمار امور فیصل شدہ میں ہونے لگا ہے -

مذہب و سیاست کی تفریق اور دنیا کے معاملات سے دین داروں کی علحدگی کا خیال یورپ میں مذہب عیسوی کی بدولت پیدا ہوا ہے اور وہیں سے مسلم ممالک میں آیا ہے اسلیے ہمیں سب سے پہلے اسکی تاریخ اور اسکے ماحول کا مطالعہ کرنا چاہیے -

مسیحیت اور تفریق دین وسیاست مسیحی مذہب دراصل محض ایک روحانی اور صوفیانہ تعلیم کا نام ہے جسکا سارا سرمایہ حضرت مسیح کی زندگی کے صرف آخری تین برس کے غیر مرتب واقعات، معجزات اور مواعظ و امثال ہیں - اُن میں کوئی دستور حیات، ضابطۂ سیاست اور قانون و آئین نہیں - یا اگر تھا تو یہودیوں اور رومیوں کے خوف سے ہمیشہ باغیانہ اور انقلابی لٹریچر کی طرح چھپایا گیا یہانتک کہ حقیقتاً گم ہوگیا اور دنیا اسکے متعلق کبھی کچھ نہ جانا - یا اُن حوادث میں جو ابتدائی مسیحی صدیوں میں پیش آئے مسیحی تعلیم کے بہت بڑے سرمایہ کے ساتھ ضائع ہوگیا - بہر حال بات ایک ہی ہے - مسیحی علماء کے پاس ایسی کوئی چیز کبھی نہ تھی جس سے وہ زمین کے کسی مختصر سے مختصر حصہ میں مختصر سے مختصر مدت کیلیے بھی مذہب کی بنیاد پر کوئی نظام حکومت قائم کرسکتے اور چلا سکتے - اس مذہب کے ابتدائی پیرو علماء و مبلغین ناموافق حالات اور اپنے مذہب کی رو سے مجبور تھے کہ راہبانہ اور صوفیانہ زندگی گذاریں - تیسری صدی تک یہ بات اُن کے تصور میں بھی نہ تھی کہ اُنکے مذہب کو کبھی مادی اقتدار حاصل ہوگا - نہ انہوں نے کبھی اسکی کوشش کی -

۳۱۲ء میں جب قسطنطین اول نے مسیحی مذہب قبول کیا تو یکایک یہ مذہب سرکاری مذہب بن گیا اور سیاست سے اسے دوچار ہونا پڑا - ظاہر ہے کہ وہ صوفیانہ و راہبانہ مذہب جسکی تعلیم تھی کہ شریر کا مقابلہ نہ کر، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اسکی طرف پھیر دے، اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اسکے ساتھ دو کوس چلا جا، اپنے دشمنوں سے محبت کرو اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے ستانیوالوں کے لیے دعا مانگ، ایسا مذہب حریص فاتحوں کا ایک دن بھی ساتھ نہ دیسکتا تھا مگر ہندوستان کے بدھ سلاطین کی طرح مسیحی سلاطین نے محض اپنی شاہانہ قوت سے اس آب آتش کو جمع کر دیا۔ علماء و پیشوایانِ مذہب نے بادشاہ کو سیاسی و انتظامی امور میں آزاد و خودمختار رکھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ دنیاوی معاملات میں وہ اسکی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ لیکن علماء اپنے معاشی حالات کی وجہ سے اور اپنے جاہ و منصب کے لیے دربار کی سرپرستی سے اور دربار اپنے سیاسی مصالح و ضروریات کی وجہ سے علماء و پیشوایانِ مذہب کی خدمات و امداد سے زیادہ دنوں تک بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے اس مشترک احتیاج کی وجہ سے سرحدیں برقرار نہیں رہ سکیں اور رفتہ رفتہ علماء اور مشائخ نے وقت کی سیاست، قصر شاہی کے معاملات، اور قوم کی ذہنیت اور نفسیات میں دخل پیدا کیا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے مذہب سے زیادہ اپنے مذہبی اقتدار اور اپنی ذاتی قابلیت سے فائدہ اٹھایا۔ کچھ ہی عرصہ بعد کلیسا کو وہ اقتدار حاصل ہو گیا جس پر بڑی سے بڑی شہنشاہی رشک کر سکتی تھی۔ اربابِ کلیسا سلاطین کا عزل و نصب کرتے تھے اور بساطِ سیاست پر شطرنج کھیلتے تھے۔ رومی کلیسا مسیحی دنیا کا روحانی قبلہ، ذہنی سرچشمہ اور قصرِ حکومت تھا۔ اسوقت حقیقتاً سیاست مذہب کے اقتدار میں آگئی تھی۔ لیکن یہ کشتی جس میں دو مختلف سمتوں میں بادبان لگے ہوئے تھے صرف اس وقت تک چل سکتی تھی جب تک کہ ایک رخ کی ہوا چلتی رہے۔ مذہب مسیحی اور سیاست مادی کے رخ بالکل مختلف اور ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ شائد یہ کشتی کچھ دن اور طوفان کا مقابلہ کرتی لیکن پیشوایانِ مذہب نے اپنا بادبان خود شکستہ کر دیا۔ انہوں نے اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ وہ پاکباز، فرض شناس انسان اور اخلاق کے علمبردار بننے کے بجائے مقدس دیوتا، لالچی سوداگر، اور عیاش فاتح بنگئے۔ انہوں نے اجتماعی مفاد کو اپنی شخصیت میں فنا کرنا چاہا۔ علم و اجتہاد کے چشمے خشک کر دیئے۔ فکر و نظر کے راستوں پر چوکی پہرے بٹھا دیئے۔ دین کو سراسر دکانداری اور علم کو تمامتر عیاری کا فن بنا دیا۔ اپنے اقتدار اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاہ کے لیے ہزاروں عقائد اور فرقے بنائے۔ فضول مذہبی مناظروں کا بازار گرم کیا۔ بے اصل باتوں پر جھگڑے برپا کیے۔ دور از کار جزئیات و فروع پر اپنا اور لوگوں کا وقت ضائع کیا۔ اپنی تمام تر توجہ اور قابلیت مضحکہ خیز مسائل کی تحقیق و تدقیق پر صرف کرنی شروع کی تحقیق اور علمی ترقی کا دروازہ بند کر دیا۔ ہر مفید و معقول تحریک، ہر بے ضرر تبدیلی اور ہر اس ترقی کی جو خدا پرستی کے خلاف نہ تھی، خواہ مخواہ مخالفت کی۔ ہر تحقیق اور ہر اکتشاف کو بے دینی ٹھیرایا۔ روشن خیال، ترقی پسند اور علم دوست گروہ کو جو پیدا ہو رہا تھا اور جسکو پیدا ہونا تھا کچل دینے کی کوشش کی۔ انکو قتل کیا، زندہ جلایا، قید کیا، جلاوطن کیا اور بلا وجہ مذہب و عقلیت میں ہمیشہ کے لیے رقابت پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ان مذہبی پیشواؤں کے ساتھ ساتھ نفس دین سے، دینی اقتدار سے، دین کی رہنمائی سے، حتیٰ کہ خود خدا تک سے بیزار ہو گئے۔

یہ حالات سو پچاس برس نہیں، صدیوں قائم رہے۔ پندرہویں صدی کی انتہا اور سولہویں صدی کی ابتدا اس عقلی جمود اور اس مذہبی بربریت کا تاریک ترین عہد ہے۔ ان حالات کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اسکے خلاف ردعمل شروع ہو اور اس خاص قسم کی مذہبیت اور اس نوع کے نمائندگان مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند ہو جائے۔ چنانچہ پندرہویں صدی میں یورپ میں دو شخص پیدا ہوئے اٹلی میں میکیاولی فرنسادی (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء)۔ اور جرمنی میں مارٹن لوتھر (۱۴۸۳ء - ۱۵۲۶ء)۔ دونوں کے اصول و مبادی میں فرق تھا مگر دونوں کی کامیابی کلیسائی اقتدار پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتی تھی۔ میکیاولی کی تحریک خالص سیاسی اور وطنی تحریک تھی۔ اسکی تبلیغ تھی کہ "مذہب کو سیاست کے ماتحت رکھنا چاہیے، کیونکہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور سیاست کا تعلق حکومت سے ہے جو ہر شے پر مقدم ہے۔ عیسائیت کا تعلق دوسری زندگی سے ہے، ہماری دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ نیکوکار انسانوں کا وجود کلیسا کے لیے مفید ہو سکتا ہے، لیکن حکومت کے لیے مفید نہیں، کیونکہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگ ضرورت کے وقت اخلاقی اصول کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ انسان فطرۃً مجبور ہے اسلیے ساری طاقت حکومت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ اخلاق کی دو قسمیں ہیں، پبلک اور پرائیویٹ۔ پرائیویٹ اخلاق سے سیاست کا کوئی تعلق نہیں"۔ لوتھر کی تحریک مذہبی اور اصلاحی تحریک تھی۔ اسکو اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جرمن قوم کی شرافت و عظمت سے اپیل کرنی پڑی اور رومی کلیسا کے اقتدار کے خلاف جذبۂ قومیت کو بیدار کرنا پڑا۔ آخرکار اس تحریک کا انجام بھی یہ ہوا کہ کلیسا کی اتحاد پرور بندش سے الگ ہوکر تمام قوموں نے اپنے اپنے قومی کلیسا الگ بنا لیے، مذہب کا ہمہ گیر انسانی تصور مٹ گیا اور ہر قوم اپنے قومی مذہب کی معتقد ہوگئی، اور اس چیز نے قوم پرستی اور قوموں کی باہمی نزاع و کشمکش کی وہ لعنت یورپ اور یورپ سے متأثر ہونے والی قوموں پر مسلط کی جس کا خمیازہ آج یورپ کے ساتھ ساری دنیا بھگت رہی ہے۔

کلیساؤں کی ذہنی غلامی سے آزادی اور کلیسائی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی یورپ میں علمی تحقیقات و انکشافات اور تمدنی ترقی کا دور شروع ہوا اور اس تہذیب نے نشو و نما پایا جسے آج ہم مغربی تہذیب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عظیم الشان تبدیلی سے یورپ کو اگرچہ کچھ فوائد حاصل ہوئے تو انکے ساتھ اسکو چند شدید نقصانات بھی پہونچے۔ اول تو، جیسا کہ ابھی اوپر اشارہ کیا گیا، مسیحی دنیا کی وہ وحدت فکر، وحدت تہذیب اور وحدت سیاسی ختم ہوگئی جو رومی کلیسا کی جوڑنے اور ملائے رکھنے والی قوت کی وجہ سے قائم تھی، اور اس وحدت کی جگہ وطنیت اور قومیت نے لے لی جس سے بڑھ کر دنیا کی صحت کے لیے کوئی زہر دریافت نہیں ہوا۔ لارڈ لوتھین نے مسلم یونیورسٹی کے کانوکیشن ایڈریس میں بالکل صحیح کہا کہ:

"جب لوتھر کی تحریک نے جسکو اصلاح مذہب کی تحریک کہا جاتا ہے یورپ کی تہذیبی اور مذہبی وحدت کو فنا کیا تو یہ براعظم مختلف قومی ریاستوں میں بٹ گیا جنکے آپس کے جھگڑے آج دنیا کے امن کے لیے مستقل خطرہ بنےگئے ہیں۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرا نقصان یہ پہونچا کہ یورپ کی سیاست دیو بے زنجیر بنگئی جسکے لیے اخلاق و شریعت کی کوئی روک نہیں رہی - میکیاولی نے جو آج یورپ کا سیاسی پیغمبر بنا ہوا ہے اور جسکی کتابیں، اہل مغرب کے لیے صحف سماوی کا درجہ رکھتی ہیں - پہلے ہی لکھدیا تھا کہ "وہ اپنا مقصد حاصل کرنیکے لیے سب کچھ کیا جاسکتا ہے" اس میں اخلاق وغیرہ کا کوئی سوال نہیں - قومی اقتدار کا جہاں سوال ہو وہاں انصاف، رحم، صداقت، پاس عہد، اور دیانت سب باتوں کو بالائے طاق رکھدینا چاہیے - میکیاولی کے بقول "حکمرانوں کو اپنے اندر لومڑی کی صفات پیدا کرنی چاہئیں" بہر حال یہ دن اس غیر مکمل مذہب کی وجہ سے، جس کا نام مسیحیت ہے، کبھی نہ کبھی پیش آنے والا تھا - حاملین مذہب کی نالائقی نے اسکو اور قریب کردیا - مذہب مسیحی کی ساخت کچھ تھی ہی ایسی کہ وہ دنیوی زندگی کا ساتھ ایک دن نہ دے سکتا تھا لوگ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ مذہب و سیاست میں نباہ نہ ہو سکا، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ کس مذہب و سیاست میں نباہ نہ ہو سکا - علامہ اقبالؒ نے خوب کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لیے نامرادی — دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

اسلام اور دین و سیاست — لیکن اسلام مسیحیت کی طرح چند عقائد اور چند مذہبی رسوم کا نام نہیں ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو ہر نوعیت کے تمدن میں، ہر قسم کے قانون اور ہر قسم کے نظام حکومت کے تحت ہر طرز زندگی کیساتھ برتے جا سکتے ہوں۔ وہ تو ایک جامع نظریہ حیات ہے جسکی بنیاد پر عقائد، افکار، اخلاق، تمدن، معیشت، سیاست اور تعلقات بین الاقوام کا ایک پورا نظام اپنے تمام شعبوں کے ساتھ بنتا ہے۔ اس کا دین اسکی دنیا سے جدا نہیں۔ اس کا اخلاق اسکی سیاست سے الگ نہیں۔ اسکے عقائد اسکے قانون سے بے تعلق نہیں۔ اسکی عبادت اسکی معاشرت و معیشت سے غیر مربوط نہیں۔ وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایک متحد المزاج ہمہ گیر نظام فکر و عمل ہے جسکے اجزاء ایک دوسرے سے کاٹ کر الگ نہیں کیے جا سکتے اور ایک جزء کو رد کر کے دوسرے جزء کو قبول کرنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس کے دائرے میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک چیز کو آپ الگ کر کہیں کہ یہ مذہب ہے، اور دوسری چیز کو اس سے الگ کر کے کہیں کہ یہ سیاست ہے۔ نہیں، یہاں جس چیز کا نام مذہب ہے اسکی بنیاد پر سیاست کی عمارت اٹھتی ہے، اور وہ سیاست، سیاست نہیں بلکہ شرارت اور خباثت ہے جو دین سے آزاد ہو۔ اسلام کسی غیر دینی سیاست کا ضمیمہ نہیں بن سکتا۔ وہ حکمرانی و جہانبانی کے لیے خود اپنا ایک واضح دستور العمل رکھتا ہے، اور اس دستور کو وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو پورے اسلام پر ایمان رکھتے ہوں نہ کہ اسکے کسی جزء پر۔

عہد رسالت و خلافت راشدہ رسول اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جامعیت دینی و دنیاوی کا مظہر اتم تھی۔ آپ بیک وقت مسجد نبوی کے امام، مدینہ کی عدالت عالیہ کے قاضی القضاۃ، ملک کے حاکم و منتظم، قوم کے امیر و حکمراں اور میدان جنگ کے کمانڈر انچیف تھے، اسلیے آپکی موجودگی میں ایک منٹ کیلیے بھی مذہب و سیاست کی تفریق کا تصور نہیں ہو سکتا تھا۔ آپکے ابتدائی جانشین بھی، جنکو تاریخ اسلام خلفاء راشدین کہتی ہے، اسی جامعیت کے حامل تھے۔ اسلام کے پروگرام کے ہر جزء پر ان کا پورا اعتقاد تھا، وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اسکو اسکے پورے اجزاء کے ساتھ نافذ کرنے پر عازم تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور انہوں نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو صرف ترقی ہی نہیں ہوئی بلکہ متوازن ترقی ہوئی یعنی اخلاق و روحانیت کی بنیاد پر سیاست کا کاروبار چلایا گیا۔ عبادات سے فوجیں تیار کیں۔ دینداری کے اصولوں پر بین الاقوامی تعلقات اور صلح و جنگ کے معاملات طے کیے گئے۔ خدا پرستی اور تقویٰ و پرہیزگاری کی بنیاد پر ٹیکس عائد کیے گئے اور پولیس اور جیل اور عدالت کا کام چلایا گیا۔ آسمانی ہدایات کے مطابق معاشی نظام قائم کیا گیا، اور اس طرح وہ دینی تمدن پیدا ہوا جو صرف اسی قسم کی حکومت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ کامیابی اس پیشنگوئی کی تکمیل تھی جو قرآن نے ان الفاظ میں کی تھی کہ:

الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج)

یہ (مظلوم مہاجر) مسلمان وہ ہیں جنکو اگر ہم زمین میں با اقتدار کرینگے تو یہ نماز و زکوٰۃ کا نظام قائم کرینگے بھلائی کا حکم کرینگے اور برائی سے روکینگے۔

انکو اپنے زمانہ میں کوئی علٰحدہ مذہبی عہدہ دار یا شیخ الاسلام رکھنے کی ضرورت نہیں تھی اسلیے کہ ان میں سے ہر ایک مذہبی عہدہ دار اور شیخ الاسلام تھا۔ انکی مسجد کا امام جس طرح مذہبی منصب رکھتا تھا اسی طرح ان کا تحصیلدار، ان کا کوتوال، ان کا مجسٹریٹ، اور ان کا گورنر بھی مذہبی منصبدار ہی تھا۔

اسلام کا عہد زوال لیکن یہ عہد سعادت زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ اسلام کی مسند حکومت پر وہ لوگ آ گئے جنکی دینی تربیت و تعلیم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسلام کے ساتھ اپنے اندر جاہلیت کا بھی معتدبہ عنصر لیے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں مسلمانوں کی زندگی کا نشو و نما غیر متوازن ہو گیا۔ مملکت کے حدود وسیع ہو گئے، سلطنت کا رقبہ بڑھ گیا، بیت المال (جو اب خزانۂ شاہی تھا) پہلے سے زیادہ معمور ہو گیا، دار السلطنت میں بڑی شاندار اور نوادر روزگار عمارتیں تعمیر ہو گئیں، پر شکوہ اور حسین مسجدیں، شاندار خانقاہیں اور وسیع مدارس بن گئے، تمدن انتہائی ترقی کر گیا، فنون لطیفہ اور علوم کو بیحد فروغ ہوا، یہ سب کچھ ہوا مگر اسلام کا اخلاقی اور دینی آئیڈیل ختم ہو گیا۔ اُس آسمانی نظام تمدن و سیاست کی جگہ، جسکا قائم کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے تھا، انسانی نظام، افلاطون و ارسطو کے نظریات اور باز نطینی رومی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ایرانی نظام حکومت نے لی۔ مذہب و نمائندگان مذہب کا اقتدار ختم ہو جانے سے ایک معزول بادشاہ کی طرح مذہب کا عملی زندگی اور سوسائیٹی پر کوئی اثر نہیں رہا اور اسکو اپنی جگہ زندگی کی کشمکش سے ہٹکر پرامن مسجدوں اور سنسان خانقاہوں میں ڈھونڈنی پڑی۔

مسلمانوں کی حکومت کے آخری عہد تک ہر سلطنت میں مشیر دینی قاضی و مفتی اور شیخ الاسلام ہوتے تھے مگر انکی حیثیت بادشاہوں کے ملازمین کی سی تھی۔ زندگی کے دوسرے لوازم اور سلطنت کے دوسرے سامان آرائش کی طرح یہ عہدے بھی ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ان وابستگان حکومت میں سے بعض علماء حق ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنا فریضہ ادا کیا اور سلطنت کو دین کی راہ پر لانے کی کوشش کی، چنانچہ تاریخ اسلام رجاء بن حیوۃ اور قاضی ابو یوسف جیسے لوگوں کو نہیں بھول سکتی۔ اول الذکر نے سلیمان بن عبدالملک کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ولی عہدی کا مشورہ دیا جس سے زیادہ مبارک مشورہ اسلام میں کبھی کسی بادشاہ کو نہیں دیا گیا۔ اور قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون الرشید کو اسلامی مالیات خراج اور شرعی بندوبست کا دستور العمل لکھ کر دیا جو آج کتاب الخراج کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن ان سب کی حیثیت مشورے کی تھی۔ امر کی نہیں تھی۔ اور دنیا کی اصلاح امر سے ہوتی ہے نہ کہ مشوروں سے۔

دربار سے باہر علماء ربانی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے تھے اور ہمیشہ حکومت وقت کے غیر دینی رجحانات کا مقابلہ خارق عادت استقامت اور ثابت قدمی سے کرتے تھے۔ لیکن یہ انفرادی کوششیں تھیں اور غیر دینی حکومت کے جو برے اثرات سوسائیٹی پر پڑ رہے تھے انکو روک نہیں سکتی تھیں۔

ترکی میں مذہب و سیاست کی تفریق

ہم مسلم ممالک میں سے ترکی کو انتخاب کرتے ہیں۔ اسلیے کہ وہ دنیائے اسلام میں مشرق و مغرب اور انکے متقابل رجحانات کی کشمکش کی سب سے بڑی جولانگاہ ہے اور مسلم ممالک اور سلطنتیں ترکی ذہنی قیادت قبول کر رہی ہیں۔ مصر، ہندوستان، افغانستان، ایران، عراق اور شام کے نوجوان مسلمانوں میں تمام تر نوجوان ترکوں ہی کے رجحانات کام کر رہے ہیں۔ امت میں سے ایک نے ہمت کر کے بے دانشی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ابتدا کردی۔ اب اس قبیل کے سب لوگ اسی کے پیچھے پیچھے چلے جارہے ہیں کیونکہ ان کے سامنے ایک تابناک مثال قائم ہوگئی۔

ہم پہلے دکھائینگے کہ سلطنت عثمانی میں علمار اسلام کی پہلے کیا حیثیت تھی اور کس طرح وہ حالات پیدا ہوئے جن سے مذہب و سیاست کی تفریق ہوئی۔

عثمانیوں کا سیاسی مزاج مختلف اسلامی و غیر اسلامی اجزا سے مرکب تھا۔ ان کا نظام سلطنت دنیا کے مختلف ریاستی تجربات اور متفرق اصول حکومت پر مبنی تھا، جسمیں اسلامی عدل و مساوات اور اسلامی پرسنل لا کے ساتھ بعض قدیم (یعنی ترکوں کے عہد جاہلیت کی) قومی خصوصیات، بازنطینی تنظیم، رومی سیاست اور افلاطون کی ریاست کے نظریات شامل تھے۔ سلطنت کے بنیادی عناصر میں سے ایک طبقہ علمار اسلام کا تھا جن کا افسر شیخ الاسلام کہلاتا تھا۔ خالدہ ادیب خانم اس طبقہ کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں :۔

"یہ ایک بہت قوی اور با اثر طبقہ تھا جسکی خاص تربیت ہوتی تھی۔ اس کا اصلی فرض یہ تھا کہ ملت اسلامی کے مذہبی اور قانونی معاملات کی نگرانی کرے۔ مگر اسکے علاوہ سلطان کے استبداد کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے وہ ایک اخلاقی قوت کا بھی کام دیتا تھا۔ صرف یہی ایک ایسی جماعت تھی جسے سلطان کے معزول کرنیکا اختیار تھا۔ بغیر اسکی منظوری کے کوئی نیا قانون نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ وہ تمام ملتوں کی طرف سے خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، سلطنت کے مقابلہ میں رعایا کے حقوق کی حمایت و حفاظت کرتا تھا۔ اس نے کئی موقعوں پر جبری تبدیلی مذہب کی مخالفت کی۔"

یہ نظام قرون متوسطہ کے مسیحی نظام حکومت سے اصولاً متحد ہونے کے باوجود اس سے برتر اور اس سے زیادہ بے ضرر تھا۔ اس میں مختلف عناصر سلطنت کے حدود و اختیارات متعین تھے، کام کی تقسیم تھی، مذہب و سیاست کی تفریق سولھویں صدی کے بعد کے نظام حکومت سے کم لیکن اسکے پیشتر کے نظام سے زیادہ تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سترہویں صدی سے جب ترک قوم کا زوال شروع ہوا تو علماء بھی اس عام قومی زوال سے محفوظ نہیں رہے۔ علماء کے زوال کی تاریخ کی دو فصلیں بہت اہم ہیں (۱) اخلاقی انحطاط (۲) علمی انحطاط۔

اخلاقی انحطاط کی تفصیل یہ ہے کہ علماء بعد کی صدیوں میں اپنے قدیم اخلاقی معیار اور اصول پر قائم نہیں رہے اور ارباب کلیسا کی طرح اپنے مذہبی اقتدار سے ذاتی منافع حاصل کرنے لگے۔ خالدہ خانم لکھتی ہیں :۔

"سلطان کو معزول کرنے کا حق جو علماء کو حاصل تھا۔ ایک مستقل اخلاقی قوت کی حیثیت سے ظلم و استبداد کو روکنے میں ایک حد تک مفید ثابت ہوا۔ مگر اس مقصد کو حاصل کرنیکے لیے انہیں فوج سے اتحاد کرنا پڑا اور سیاسی امور میں دخل دینا پڑا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کی جماعت اب ایک غیر جانبدار قانونی اور مذہبی جماعت نہیں رہی۔ مذہب بھی بساط سیاست کا ایک مہرہ بن کر رہ گیا۔"

علمی انحطاط :۔ ترکی میں علماء کی ذمہ داریاں تمام مسلم ممالک کے علماء سے زیادہ نازک تھیں۔ اسکے کئی اسباب تھے۔ اول یہ کہ وہ یورپ میں نئے علوم وفنون کے طلوع ہونے والے آفتاب کا مشرق تھا اور جہاں (اقبال کی زبان میں) "ستاروں کی گردش تیز اور ہر ذرہ کے دل میں غوغائے رستاخیز تھا"

دوسرے انکا مقابلہ ان اقوام سے تھا جنہوں نے اختراعات و انکشافات کی نئی دنیا دریافت کرلی تھی، جو قوائے طبیعیہ کی تسخیر اور اسرار فطرت کی نقاب کشائی اور دنیا کی ہونے والی سیاسی و اقتصادی و ذہنی جنگ کیلیے نئے نئے اسلحہ دریافت کر رہی تھیں اور قلعے تعمیر کر رہی تھیں۔

تیسرے یہ وہ زمانہ تھا جسکا ایک ایک منٹ ایک ایک سال کے برابر تھا جس میں قوموں کی قسمتیں لکھی جا رہی تھیں اور دنیا کا آئندہ نقشہ تیار کیا جا رہا تھا۔

ناممکن تھا کہ اس عام تلاطم کے زمانہ میں ترکی کے بحر خاموش میں تموج نہ پیدا ہوتا۔ اس حالت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علماء کا فرض تھا کہ زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے، اسکے سینہ کی دھڑکن کو دیکھتے، اور صرف یہی نہیں بلکہ زمانہ کی رہنمائی کے قابل بننے کی کوشش کرتے، نئے رجحانات اور تقاضوں کی نگرانی کرتے، صحیح تقاضوں کو پورا کرنے اور غلط تقاضوں کو روکنے اور درست کرنے کی طاقت پیدا کرتے، نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرتے کہ وہ علمی وفنی ترقی میں مغربی قوموں کے ہمدوش بھی ہوتے اور پھر مسلمان بھی رہتے نیز اسلامی تمدن، اسلامی نظام حکومت اور اسلامی ثقافت کی برتری ثابت کرتے اور انکو اسلامی رنگ میں کم سے کم اتنا رنگ دیتے کہ انکے ہاتھوں سے سیاست و تمدن میں جو انقلاب ہوتا وہ سراپا غیر اسلامی نہ ہوتا۔ اس غرض کے لیے علماء کو اپنے قدیم طرز تعلیم و نظام ترمیم پر نظر ثانی کرنی چاہیے تھی اور جدید علمی بیداری کا نہ صرف ساتھ دینا چاہیے تھا بلکہ مسلم ہونے کی حیثیت سے اسکی پیشوائی کرنی چاہیے تھی۔ ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ انقلاب کو روکنے کی کوشش نادانی ہے۔ عقلمندی یہ ہے کہ اس کا رخ پھیر دیا جائے اور اسکو مفید یا کم سے کم بے ضرر بنانے کی سعی کی جائے۔

نہ صرف ٹرکی بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ اس دور میں جو لوگ علم دین کے حامل تھے وہ ان فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا تو کیا کرتے، سمجھنے کے قابل بھی نہ تھے۔ اسکی تفصیل خالدہ ادیب خانم کی زبان سے سنیے :-

"ملت اسلامی کی تعلیم انہی علماء کے ہاتھ میں تھی۔ جبتک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی یہ لوگ اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے۔ مدرسۂ سلیمانیہ۔ اور مدرسہ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم وفنون کے مرکز تھے۔ مگر جب مغرب نے کلامیات کی زنجیروں کو توڑ کر نئی علم و حکمت کی بنیاد ڈالی جسنے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علماء کی جماعت معلمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں رہی۔ یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرھویں صدی میں تھا وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا۔ یہ طرز خیال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انیسویں صدی کے وسط تک انکے نظام تعلیم پر حاوی رہا۔ انہوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ جب تک ملت اسلامی کی تعلیم کی باگ انکے ہاتھ میں تھی کیا مجال کہ کوئی نئی چیز قریب آنے پائے نتیجہ یہ ہوا کہ انکے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا۔ ادھر دور انحطاط میں انکی سیاسی مصروفیتیں اسقدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدے اور تجربے کے جھمیلے میں پڑنے کی انہیں فرصت نہ تھی۔ سہل نسخہ یہی تھا کہ ارسطو کے فلسفہ پر قدم جمائے رہیں اور علم کی بنیاد استدلال پر رہنے دیں۔ چنانچہ اسلامی مدارس کا انیسویں صدی میں بھی وہی رنگ رہا جو تیرھویں صدی میں تھا۔"

"سنہ ۱۸۶۰ سے حکومت نے ابتدائی تعلیم کے مدارس قائم کیے جنمیں جدید نصاب رائج تھا مگر انکی تعداد بہت کم تھی۔ طلبہ کی کثیر تعداد بدستور مسجدوں کے مکاتب میں پڑھتی رہی اور اس وجہ سے عام لوگوں کی تعلیم پر وہی جمود طاری رہا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آگے چل کر جو کچھ اصلاحات اور تبدیلیاں ہوئیں وہ بجائے اسکے کہ صحیح ارتقا اور نشو و نما کا نتیجہ ہوتیں، حکمران طبقہ کی طرف سے زبردستی عائد کی گئیں، انکی نافذ کرنے والی عموماً ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی تھی جو علماء کو نہ صرف تعلیم سے بے دخل کرنا چاہتی تھی بلکہ انکی اخلاقی اور روحانی حکومت کی بیخ کنی کے درپے تھی۔"

نوجوانوں کی مذہب سے بیزاری اور بدگمانی کے وجوہ میں ایک بڑی وجہ اُن سلاطین کا جبر و تشدد، جمود، توہم، اور سوء ظن تھا جو خلیفۃ المسلمین کہلاتے تھے اور نائب رسولؐ و حامی اسلام سمجھے جاتے تھے۔ خصوصاً خلافت کے سب سے بڑے مدعی و مبلغ سلطان عبدالحمید خان کے سلوک و رویہ نے نوجوان ترکوں کو اور زیادہ مشتعل اور زخم خوردہ بنا دیا۔ ٹرکی کے ان پچھلے سلاطین نے سلطنت عثمانیہ میں قرون متوسطہ کے با اقتدار ارباب کلیسا کا پارٹ ادا کیا اور مذہب کی انتہائی غلط نمائندگی کی۔

ان تمام اسباب کے باوجود نوجوان ترک بہرحال اپنی غلطیوں کی ذمہ داری سے بری نہیں ٹھیرائے جا سکتے۔ جب انہوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود حکومت کا بار اٹھایا تھا تو انہیں اپنے فرائض سے بھی واقف ہونا چاہیے تھا - ان کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ لڑ بھڑ کر آبائی زمین کو بچانے کی کوشش کرتے، بلکہ اسکے ساتھ انکو سنجیدہ مفکر بھی بننا چاہیے تھا اسلیے کہ ان پر حیاتِ نو کی تعمیر جدید کا بار بھی آپڑا تھا - انکو دین او رنمائندگانِ دین میں امتیاز کرنا چاہیے تھا - انہوں نے جہاں جرمنی، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے قوانین اور یورپ کے علوم عمرانیہ کا مطالعہ کیا تھا انکا فرض تھا کہ قرآن و حدیث کا بھی مطالعہ کرتے - لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ اس حیثیت سے نہایت پست درجہ کے نکلے - واقعہ یہ ہے کہ انقلاب ترکی کے آخری ایام موت وحیات کی کشمکش، قومی مصائب، اور میدان جنگ کی مصروفیات کے ایسے ایام تھے جن میں ترک جیسی بر سر انحطاط قوم کے لیے اپنا دماغی توازن قائم رکھنا مشکل تھا - جن لوگوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت ان غیر متوازن حالات میں ہوئی انکی تربیت نہایت ناہموار ہوئی - یہ تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے خام، اخلاق و خصائل کے لحاظ سے ادھکچرے اور علمی و ذہنی حیثیت سے ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے - انتہا پسند، کم غور کرنے والے، جلد باز، سطحی النظر، خام کار، اور ہر میدان میں یورپ سے شکست خوردہ، یہ تھا ان کا عقلی مزاج - اور بدقسمتی سے ترکی جدید کی تعمیر کا سارا کام بالکل انہی لوگوں کے ہاتھ میں آگیا کیونکہ کوئی دوسری بہتر درجہ کی جماعت اتنی منظم اور طاقتور موجود نہ تھی جو اسکو اپنے ہاتھ میں لیتی - خالدہ ادیب، جو خود انجمن اتحاد و ترقی کی رکن رہ چکی ہیں، اور جنہوں نے جنگ عظیم کے بعد بھی ایک اچھی خاصی مدت تک ترکی جدید کے معماروں کے ساتھ کام کیا ہے، صاف الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرتی ہیں :-

"اتحاد و ترقی کی نوجوان ترک چھوٹے درجہ کے سرکاری ملازم یا فوجی افسر تھے - ابتداء میں انکے اندر ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اعلیٰ علمی قابلیت رکھتا ہو اور تحلیل و تنقید سے کام لیکر پرانے اور نئے زمانہ کے فرق کو سمجھ سکے - مگر یہ لوگ جمہور سے زیادہ قریب اور خالص دیسی پیداوار تھے - ان میں زیادہ تعداد مقدونیہ کے باشندوں کی تھی جو واقعیت پسندی اور بے رحمی میں مشہور ہیں اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے کیلیے سب کچھ کر گذرتے ہیں - اسلیے گو وہ اعلیٰ مقصد رکھتے تھے مگر ہر طرح کے وسائل و ذرائع بے تکلف اختیار کر لیتے تھے "

(باقی)

© rasailojaraid.com